پروفیسر بشیر احمد نحوی کی اقبال شناسی
نظریہ تصوف کے تناظر میں

گلزار احمد ڈار

اردو ادب میں جس ہستی پر سب سے زیادہ تحقیقی وتنقیدی کام ہوا ہے اور ہنوز شد و مد سے جاری ہے وہ اقبال ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں اس ہستی سے متعلق جو تحقیقی وتنقیدی مواد جمع ہوا ہے وہ شاید ہی کسی اور کے حوالے سے ملے۔ برصغیر میں جتنے بھی اقبالیاتی ادارے اور ان سے منسلک اہل علم ہیں وہ اس کام میں اپنی مثال آپ رکھتے ہیں۔ان میں ریاست جموں وکشمیر بھی ایک اہم مقام رکھتی ہے۔کشمیر میں اقبال چیئر کی بنیاد ۱۹۷۵ء میں رکھی گئی جسے بعد میں ایک باضابطہ ادارے کی شکل دی گئی۔ابتدا میں اسے پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر شکیل الرحمان اور پروفیسر محمد امین اندرابی جیسے اکابر کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ بعد میں اس ادارے کو پروفیسر بشیر احمد نحوی جیسے عاشق اقبال کی سرپرستی ملی۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی ایک ایسے محقق اور نقاد ہیں جن کی ساری زندگی اسی دشت کی سیاحی میں گزری۔ انہوں نے جو کچھ لکھا اس کا اہم حصہ ان کی تحقیقی وتنقیدی تصانیف پر مشتمل ہے، جو اقبالیات کے حوالے سے ہیں۔ان کی تصانیف اور تالیفات کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

تصانیف: نظریہ تصوف اور اقبال ، اقبال عرفان کی آواز، اقبال ایک تجزیہ ، وحدت الوجود اور اقبال، اقبال افکار واحوال ، محسوسات، احساس وادراک۔

تالیفات: اقبالیات مجلّہ شمارہ ۱۲ تا ۲۰، دانائے سبل ختم الرسلؐ، نفحات اقبال، اقبال بحر خیال، حکیم مشرق، اقبال کی تجلیات، بیاد شوریدہ کاشمیری، اقبال گزشتہ دس سال، بیاد خواجہ امین بچھ، تاریخ الانبیاء ، فکر آزاد، ارمغان نحوی، *Iqbal's Religious Philosophical Ideas, Iqbal's Multiformity, Iqbal's Ideas of Self*۔

بشیر احمد نحوی کی تصنیف نظریہ تصوف اور اقبال ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ ہے جو وہ پروفیسر آل احمد سرور اور ضیاء الحسن فاروقی کی مشترکہ نگرانی میں ضبط تحریر میں لائے۔ ڈاکٹر پیر نصیر احمد اس مقالے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

گیارہ ابواب پر مشتمل اس پر مغز مقالے میں تصوف سے متعلق مختلف نظریات بالخصوص وجود و شہود کے نظریہ پر ایک تسلی بخش بحث کی گئی ہے۔ تصوف کے حوالے سے اقبال کے وقتاً فوقتاً کئے گئے شدید ردعمل کا بھی تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔[۱]

اس مقالے کا پہلا ایڈیشن مسائل تصوف اور اقبال کے عنوان سے مئی ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ جب کہ اسی مقالے کو میزان پبلی شرز بٹہ مالو سرینگر کشمیر نے نظریہ تصوف اور اقبال کے زیر عنوان دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے حرف آغاز میں پروفیسر بشیر احمد نحوی یوں رقمطراز ہیں:

نظریہ تصوف اور اقبال کی اشاعت پر اس بات کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ اقبال کی ہمہ پہلو شخصیت اور اس شخصیت سے وابستہ افکار و تصورات میں نظریہ تصوف اپنی انفرادیت کا حامل موضوع ہے۔ متعدد اصحاب علم و قلم نے اس موضوع پر اپنے اپنے منفرد انداز میں وضاحت کی ہے لیکن موضوع اس قدر سنجیدہ اور ہمہ گیر ہے کہ اس پر مزید غور و فکر کرنے کے امکانات موجود ہیں۔ اقبال خالص اسلامی تصوف کے حامی تھے اور تصوف میں تمام غیر اسلامی عناصر کو زائل کرنے میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ راقم نے اس کتاب میں ان تمام امور کو زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں اقبال کا ردعمل کیا رہا ہے اس پر اظہار رائے کیا گیا ہے۔[۲]

اس کتاب کی طبع اول میں شامل بشیر احمد نحوی کا لکھا ہوا پیش لفظ ہے۔ اس میں بشیر احمد نحوی اس موضوع کی اہمیت اور پیچیدگی پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تصوف کے کثیر الابعاد موضوع پر مشرق و مغرب کے علماء اور صوفیاء نے مدلل اور مفصل کتابیں سپرد قلم کی ہیں۔ مذکورہ موضوع دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے پیچیدہ بھی ہے۔ اس موضوع کو اقبال کے فکری اور شعری سفر میں اہم سنگ راہ کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اقبال نے اپنے نظم و نثر میں تصوف کے بطن سے جنم لینے والے بیشتر مسائل و امور اور اطراف و جہات کی بالتفصیل وضاحت کی ہے۔ میں نے اس کتاب میں تصوف سے متعلق ان مختلف نظریات بالخصوص وجود و شہود کے نظریے سے تفصیلی بحث کی ہے اور اس سلسلے میں علماء و صوفیاء کی گراں بار آرا کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ چنانچہ جزئیات میں الجھنے سے بچ کر اقبال کے اس شدید ردعمل کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جو انہوں نے تصوف کے حوالے سے وقتاً فوقتاً ظاہر کیا ہے۔ اقبال کے دل و دماغ میں صوفیا کی کس شاخ یا سلسلے کا احترام موجزن تھا اور اس کے کیا اسباب و محرکات تھے اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تصوف میں کئی امور متنازعہ رہے ہیں جن پر علماء کے درمیان بڑی تلخ نوائی ہوتی رہی

ہے۔ میں نے ان امور میں صرف وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے تعلق سے حضرت ابن عربی اور حضرت مجدد الفِ ثانی کے خیالات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔[۳]

واضح رہے کہ یہ پیش لفظ اس کتاب کے طبع اول میں شامل ہے، جب کہ طبع دوم اس سے خالی ہے۔

اس کتاب میں بشیر احمد نحوی نے سب سے پہلے تصوف کی تعریف میں مختلف علماء وفضلاء کی آراء سے مدد لی ہے اور اس کے تاریخی پس منظر کا جائزہ پیش کرتے ہوئے صوفیاءِ کرام کے مختلف گروہوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ان گروہوں کے حوالے سے پروفیسر بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

> خلافت راشدہ اور سانحہ کربلا کے بعد جو دوسرے واقعات ظہور پذیر ہوئے، ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے امت میں ایسے علماء اور صوفیاء کا ایک گروہ پیدا کیا......صوفیائے کرام کا دوسرا گروہ اس وقت سامنے آیا، جب یونان کے عقلیت پسند فلسفے نے شریعت اسلامیہ کی بنیادوں کو متاثر کرنے کی کوشش کی ......صوفیائے کرام کا تیسرا گروہ دسویں صدی عیسوی سے متعلق ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان فقہی مسائل ومعاملات کی پیچیدگیوں میں الجھ کر اپنی منزل اور اصل کو بھول چکے تھے۔[۴]

پروفیسر بشیر احمد نحوی نے اس کتاب میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح تحریک تصوف نے، کن کن حالات اور کن کن منزلوں سے گزر کر نشوونما پائی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ تحریک کس طرح اپنی اصلیت کو مسخ کر کے نقطہ انحراف میں پڑ جاتی ہے۔ اپنے بیان کے تائید میں بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

> تصوف تصفیہ اخلاق، تزکیہ باطن کی صفات پیدا کرنے اور انہیں پروان چڑھانے کے لئے وجود میں آیا تھا، رفتہ رفتہ اپنی اصلیت اور حقانیت سے ہٹ کر نقطہ انحراف کی طرف بڑھنے لگا۔ تصوف کے ساتھ ایسے لوگ بھی وابستہ ہو گئے جو علم وعمل اور تقویٰ وطہارت سے عاری تھے اور انہوں نے ایسی اصطلاحات گھڑ لیں جو براہ راست قرآن مجید اور سنت نبویؐ کے ساتھ متصادم تھیں اسلام نے عبادات کے جو قاعدے مقرر کر لئے ہیں ان لوگوں نے ان قاعدوں کا ہی تمسخر اڑانا شروع کیا اور اس طرح شریعت کے فرائض واحکام سے لاتعلقی کا ماحول پیدا ہونے لگا۔[۵]

بشیر احمد نحوی نے اپنی کتاب میں فارسی کتاب کشف المحجوب اور صوفیاء کے مختلف فرقوں کے بارے میں سیر حاصل تفصیل دی ہے۔ دراصل یہ کتاب کشف المحجوب پانچویں صدی کے ایک بزرگ سید ابوالحسن علی ہجویریؒ کی تصنیف ہے۔

بشیر احمد نحوی اپنی کتاب میں سلاسل تصوف کا تعارف کراتے ہیں۔ تصوف وطریقت نے جب ایک فکری نظام اپنایا اور متعدد صوفیاء ومشائخ نے اپنی مخلصانہ کوششوں کے ذریعے اس نظام کی بنیادوں کو استواری عطا کی، تو آہستہ آہستہ تصوف کے کئی سلسلے وجود میں آنے لگے اور ہر سلسلہ اپنے مخصوص طریقہ عمل

ونصاب میں شریعت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے لوگوں کی مذہبی واخلاقی رہنمائی کا فریضہ حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتا رہا۔ بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

> سلاسل جو معرض وجود میں آ گئے ان میں پانچ سلسلوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی۔ وہ پانچ سلسلے حسب ذیل ہیں: سلسلہ نقشبندیہ، سلسلہ قادریہ، سلسلہ چشتیہ، سلسلہ سہروردیہ اور سلسلہ کبرویہ۔[۶]

اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر بشیر احمد نحوی تصوف سے متعلق غلط فہمیوں اور شبہات کے سلسلے میں اکابرین کی آراء اور مباحث اور اس سے جڑی غلط فہمیوں کے ضمن میں ایک سیر حاصل جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں، کہ اسلامی نظریہ توحید کے مطابق بھی حق تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے اور کائنات کی ہر چیز ذات میں شامل ہے اور اسلامی نظریہ وحدت الوجود کی رو سے بھی ذات حق ہر جگہ موجود ہے اور کوئی چیز اس سے علیحدہ نہیں ہے۔ اس لئے نظریہ وحدت الوجود اور اسلامی نظریہ توحید کے مابین کوئی نزاع یا اختلاف نہیں ہے۔ اسلامی نظریہ توحید (Monothesim) کے خلاف جو نظریہ وحدت الوجود ہے وہ غلط قسم کا عیسائی اور ہندوانہ نظریہ وحدت الوجود ہے جس میں جز کو بھی کل کا درجہ دے دیا گیا ہے اور قطرہ کو بھی سمندر بنا دیا گیا ہے حالانکہ قطرہ اگرچہ سمندر کا ایک ادنیٰ حصہ ہے، سمندر ہرگز نہیں کہلایا جا سکتا ہے۔

اس طرح یہ کتاب اپنے اصل موضوع کو بیان کرتی ہے یعنی ''اقبال اور نظریہ وحدت الوجود''۔ اس کے ذیل میں پروفیسر موصوف تصوف کے روایتی نمونے پیش کرتے ہوئے اقبال کے اجتہادی نظریہ تصوف تک پہنچتے ہیں۔ چنانچہ اقبال نے جو وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا ہے اس سے اکثر علماء نے اختلاف ہی ظاہر کیا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر نحوی لکھتے ہیں:

> الغرض علامہ کے یہاں کہیں وحدت الوجود کا انتہائی نظریہ نہیں ملتا۔ ان کے کلام میں اگر کہیں کہیں وحدت الوجودی رنگ نظر آتا ہے تو اس میں ایک اعتدال ہے اور یہ توحید خالص یا وحدت شہودی کے منافی نہیں، بلکہ موافق ہے۔[۷]

پروفیسر قدوس جاوید اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> تصوف سے متعلق اقبال کے اجتہادی تصورات سے علماء نے اگر اتفاق سے زیادہ اختلاف کیا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اقبال شاعر اسلام ہونے کے ساتھ ساتھ مشرق خصوصاً برصغیر کی بیداری اور تعمیر نو کے شاعر بھی ہیں اور تصوف سمیت جتنے بھی مذہبی، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی نکات پر اقبال نے خیال آرائی کی ہے اپنی اس ہمہ جہت حیثیت سے کی ہے ایک منفرد اور اجتہادی انداز کے ساتھ۔ البتہ یہ منفرد رویہ اور اجتہادی انداز اس غیر معمولی تاریخی، عمرانی، ثقافتی اور فنی شعور سے عبارت ہے جو اقبال کے یہاں اسلامی ہندستان اور یورپی نظریات، حیات اور اقدار و روایات علم وفن کے بصیرت مندانہ تجزیہ و تحلیل کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔[۸]

علامہ اقبال نے تصوف کے روایتی تصورات کے خلاف جو شدید ردِعمل ظاہر کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ غیر اسلامی اور توحید خالص کے منافی تھا۔ حالانکہ اقبال ابتدا میں وجودی تھے لیکن قرآنِ مجید پر تدبر کرنے سے ان کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ بعض اکابر صوفیاء کے عقائد و مسائل قطعاً غیر اسلامی ہیں جیسے مسئلہ وحدت الوجود۔ یہ اسلامی مزاج یا قرآنی نقطہ نگاہ سے توحید کے منافی ہے۔ یہی خرابی وجودی یا روایتی تصوف کے دیگر عقائد و مسائل میں بھی ہے۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

اقبال موحد ہے اور توحید میں کسی قسم کے اشتراک کو گوارہ نہیں کرتا۔ مسلمانوں میں جو بعد میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بحثیں چھڑ گئیں اقبال کے نزدیک یہ بحثیں دینی بحثیں نہیں بلکہ فلسفیانہ مسائل و مباحث ہیں۔ اسلام میں توحید کے مقابلے میں فقط شرک ہے۔ وحدت و کثرت کی بحث اسلامی بحث نہیں اور نہ ہی اشاعرہ اور معتزلہ کے یہ کلامی مباحث اصل اسلام سے کچھ تعلق رکھتے ہیں۔ وحدت ذات کے اندر کثرت صفات الٰہیہ عین ذات ہیں یا غیر ذات۔ اس کے نزدیک خدا ایک نفس کلی یا ایک انا ہے، انائے کامل و مطلق خدا ہے۔ اس کی عینی اور اساسی صفت خلاقی ہے۔ کل یوم ھو فی شان کے معنی اقبال کے نزدیک یہی ہیں کہ اس کی خلاقی مسلسل اور لامتناہی ہے۔ کن فیکون کی صدا ہر لمحے میں آرہی ہے۔[۹]

پروفیسر بشیر احمد نحوی نے اپنی تصنیف نظریہ تصوف اور اقبال میں مستند اور معتبر حوالوں سے اقبال کے اس شدید ردِعمل کو ظاہر کیا ہے جس کا کھلا اظہار انہوں نے 'شمع اور شاعر' میں اور بعد میں اسرار خودی میں واضح طور پر کیا ہے۔ چنانچہ اسرار خودی عجمی تصوف کے خلاف اعلان بغاوت تھی اور احیاء شریعت اسلامیہ کے لئے ایک نیک کوشش۔ چنانچہ اقبال اس ضمن میں خود لکھتے ہیں:

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈل بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہؐ کے منہ سے ہوئی۔[۱۰]

اقبال فطری طور پر ملت اسلامیہ اور مشرق کے جد وجہد اور عمل پر ہی متوجہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے وحدت الوجود کی مخالفت اور وحدت الشہود کی حمایت کی۔ کیونکہ ان کے نزدیک وحدت الوجودی نظریے میں رہبانیت اور بے عملی تھی۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

رہبانیت دنیا کی ہر مستعد قوم میں اس کے عملی زوال کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مٹانا ناممکن ہے کہ بعض رہبانیت پسند طبائع ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ جو کچھ ہم کر سکتے ہیں وہ صرف اسی قدر ہے کہ اپنے دین کی حفاظت کریں اور اس کو رہبانیت کے زہریلے اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔[۱۱]

پروفیسر بشیر احمد نحوی نے مسائل وجودی و شہودی کے سلسلے میں بیشتر حوالے ابن عربی اور مجدد الف ثانی سے لئے ہیں اور انہی عمائدین کے تقابل میں فکر اقبال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اقبال نے خود

بھی وجودی وشہودی مسائل پر خصوصی توجہ دی ہیں۔ اقبال کے یہاں ان عمائدین کے اثرات نمایاں ہیں۔ اقبال ابتدا میں جہاں مولانا رومی سے متاثر تھے وہیں مجدد الف ثانی کے خیالات اور اقبال کے خیالات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

بہر حال پروفیسر بشیر حمد نحوی نے اس کتاب میں اپنی محنت شاقہ اور تحقیقی وتنقیدی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظریہ تصوف اور اقبال کے حوالے سے مستند اور معتبر حوالوں سے اس کتاب کو مزین کیا ہے۔ اس بحث کو سمیٹتے ہوئے یہاں میں سید رسول پونپر کا یہ اقتباس بھی درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اس کتاب کی اہمیت وافادیت پر دلالت کرتا ہے:

> بشیر احمد نحوی نے مثالی دقتِ نظری اور عرق ریزی سے تصوف کے مسائل کو ممکنہ اور مختلف مآخذ کو کھنگال کر اجاگر کیا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود یا ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کو تاریخی شواہد کی روشنی میں اس طرح بحث کا موضوع بنایا گیا کہ شکوک وشبہات کے بادل از خود چھٹ جاتے ہیں اور طمانیت وتیقن کا سورج ظلمات کے اندھیروں پر ضوفگن ہوتا ہے۔ بشیر احمد نحوی نے شائستگی، باسلیقہ، ہنرمندی اور سرفراز نیاز مندی سے قرآن وحدیث کی روشنی میں تصوف کے موضوع سے مربوط بنیادی اصطلاحات کے چہرے سے نقاب الٹ کر اصل حقائق سے شائقین محترم کا رشتہ باندھا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے جس کے لئے وہ لائق صد تحسین وآفرین ہیں۔[۱۲]

حوالہ جات وحواشی

۱- ڈاکٹر پیر نصیر احمد، کشمیر میں اقبال شناسی کا سفر، ص ۴۷۔
۲- بشیر احمد نحوی، نظریہ تصوف اور اقبال، حرف آغاز، طبع دوم، ۲۰۱۱ء۔
۳- ایضاً۔　۴- ایضاً، ص ۱۰-۱۴۔　۵- ایضاً، ص ۳۳۔
۶- ایضاً، ص ۳۴۔　۷- ایضاً، ص ۶۹۔
۸- بشیر احمد نحوی، اقبالیات گزشتہ دس سال، ص ۶۹۔
۹- بشیر احمد نحوی، نظریہ تصوف اور اقبال، ص ۱۶۱۔
۱۰- بحوالہ ایضاً، ص ۱۶۱۔　۱۱- ایضاً، ۱۲۰۔
۱۲- سید رسول پونپر، پیش آہنگ، ص ۱۲۸-۱۲۹۔